(غلام گردش)

" گھگھوگھوڑے "

ڈاکٹر علی حماد کا امریکہ سے فون آیا کہ فلم بنانی ہے۔ دس برس پہلے کی بات ہے۔ ڈاکٹر علی، امریکہ میں دل کا سرجن ہے اور حد درجہ عمدہ صوفی شاعر ہے۔ تصوف کی طرف کیسے مائل ہوا، یہ بھی ایک مکمل داستان ہے۔ بہر حال اس وقت برصغیر کا ایک عمدہ شاعر ہے۔ زبان و بیاں میں کلاسیکل رویہ موجود ہے۔ مگر ہرگز ہرگز شہرت کی طرف مائل نہیں ہے۔ راہِ فنا کا تنہا مسافر۔ جواب بالکل بے ساختہ تھا کہ مجھے تو فلم بنانے کا کوئی تجربہ نہیں۔ الف بے نہیں معلوم۔ ڈاکٹر یہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں نت نئے تجربے کرنے چاہییں، یہی جدت اصل زندگی ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایک دھائی قبل لکھنے کی طرف مائل تو تھا۔ مگر رجہان کہانیوں کی جانب تھا۔ یہ تو لطیف چوہدری کا کمال ہے کہ مجھے کالم نویسی پر لگا دیا۔ بہر حال اب کالم لکھتا ہوں اور بدستور لکھ رہا ہوں۔

دو دن کے بعد ڈاکٹر علی کو فون کیا کہ ہمیں مکمل فلم نہیں بلکہ ٹی وی کیلئے چھوٹے دورانیہ کی فلم بنانی چاہیے۔ اسکو ٹیلی فلم کہا جاتا ہے۔ خود ہی کہا کہ کہانی میں خود لکھونگا۔ سکرپٹ کے بعد ٹیلی فلم بنانے کے تمام مرحلے طے کرینگے۔ خیر کہانی لکھنی شروع کر دی۔ لکھنے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا۔ خستہ کہانی کو مکالموں میں تبدیل کرنا بھی کافی دشوار مرحلہ تھا۔ اسکا تجربہ قطعاً قطعاً نہیں تھا۔ ایک دوست سے دشواری کا ذکر کیا۔ اس نے لاہور کے ایک سٹوڈیو سے ایک اردو ٹائپسٹ فراہم کیا جو پوری زندگی مکالمے لکھتا رہا تھا۔ حد درجہ شائستہ آدمی۔ میں مکالمے ترتیب دیتا تھا اور وہ اسے لکھتا جاتا تھا۔ اگلے دن پھر یہی دشوار کام شروع ہو جاتا تھا۔ مکالمے لکھنے اور ترتیب دیتے ہوئے ایک ماہ لگ گیا۔ اتنا طویل وقت درکار نہیں تھا مگر سرکاری نوکری سارا دن ضائع کر دیتی تھی لہذا یہ دورانیہ طویل ہو گیا۔ بہر حال ہوتا یہی تھا کہ شام کو دو تین گھنٹے، اس طرح گزر جاتے تھے جیسے ایک لمحہ۔ اب ایک نئی مشکل کا سامنا تھا، کہ ٹیلی فلم کا عنوان کیا رکھا جائے۔ کئی دن سوچتا رہا۔ متعدد نام ذہن میں آتے رہے۔ مگر ایک نام بار بار اپنے وجود کا احساس دلاتا رہا۔ وہ تھا، " گھگھوگھوڑے "۔ یہ بنیادی طور پر مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے جانور ہوتے ہیں، جو ہر دیہات میں کمہار بناتے رہتے ہیں۔ پھر یہ ٹوکریوں میں بکتے رہتے ہیں۔ یہ نام کہانی کی مناسبت سے بہترین تھا۔ کیونکہ کہانی تھی ہی ہمارے سیاسی نظام کے متعلق۔ مفہوم یہی تھا کہ ہمارے مقتدر طبقے کیلئے طاقت کے کھیل میں کسی قسم کا کوئی اُصول نہیں ہے۔ انہیں اقتدار چاہیے اور بس۔ ہر قیمت پر اور ہر دور میں۔ یہ دراصل ایک سچی کہانی تھی مگر اسے ڈرامائی رنگ دے دیا تھا۔ مقصد صرف ایک تھا کہ لوگوں میں احساس ہو کہ عام آدمی کی وقعت مٹی کے بنائے ہوئے ادنیٰ گھوڑے سے زیادہ نہیں ہے۔ باقی صرف اور صرف نعرے ہیں۔ اس المیہ میں ایک دکھ اور بھی ہے کہ سیاست میں دین کی آمیزش کر دی گئی ہے۔ چند حکمرانوں نے اپنے عیب چھپانے کیلئے دین کو بڑی عیاری سے استعمال کیا ہے۔ وہ مکمل طور پر کامیاب رہے۔ مستقبل میں بھی یہ محلول استعمال ہوتا رہیگا۔ جس بے دردی سے مذہبی رسومات کے رسمی عمل کو دین بنا دیا گیا ہے، وہ قابل ذکر بھی ہے اور سوچنے کا مقام بھی۔ عمل کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ خیر یہ ایک طویل بحث ہے۔ اس پر ضرور لکھونگا اور بے خوف لکھونگا۔

بات کہانی کی ہورہی تھی۔ ویسے عجیب بات ہے کہ میری دس سال پہلے لکھی ہوئی کہانی کا ایک ایک لفظ سچ ثابت ہوا۔ گھگھوگھوڑے لکھنے کے بعد، مرحلہ تھا کہ اسکو باقاعدہ ایک ٹیلی فلم کے خدوخال میں ڈھالا جائے۔ علی حماد اور مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ فلم کے شعبہ کے مسائل کیا ہیں اور سنجیدگی کی کتنی کمی ہے۔ کمی کا لفظ بالکل درست نہیں ہے۔ ہمارے فلمی شعبہ میں سنجیدگی کا وجود ہی نہیں ہے۔ ڈائریکٹر کا انتخاب کلیدی حیثیت کا تھا۔ جس بھی نامور ڈائریکٹر سے ملے، یہی کہتا تھا کہ مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ یہ تو اسکے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ جب پوچھتے تھے کہ آپکی آخری کامیاب ٹیلی فلم کونسی تھی تو وہ خاموش ہوجاتا تھا۔ یا کوئی ایسا نام بتاتا تھا جسکے متعلق کم از کم ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چند دن کی کوشش کے بعد، ایک ادھیڑ عمر ڈائریکٹر سے ملاقات ہوئی۔ ٹی وی میں مزاحیہ پروگرام بناتے تھے۔ انہوں نے ہم سے دو باتیں کیں۔ ایک تو وہ اپنی فیس ایڈوانس میں لینگے۔ دوسرا یہ کہ ٹیلی فلم کو فروخت کرنے کی فیس بھی پہلے وصول کرینگے۔ میری دانست میں یہ ایک بہترین بات تھی کہ ٹی وی چینلز پر ڈائریکٹر خود ہی گھگھوگھوڑے فروخت کردیگا۔ علی حماد سے مشورہ کرکے ساری رقم ایڈوانس اس ڈائریکٹر کے حوالے کردی۔ ڈائریکٹر صاحب نے جو بھی اداکار یا اداکارہ کو سترمنٹ کی ٹیلی فلم کیلئے سائن کیا، اسے بھی پچاس فیصد رقم ایڈوانس دلوادی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ہمیں دھوکہ دے رہا تھا۔ جس پرفارمر کی فیس چالیس ہزار تھی۔ اسے ڈائریکٹر اَسی ہزار دلوا رہا تھا۔ اس میں دس سے بیس ہزار روپے اسکی جیب میں واپس آجاتے تھے۔ خیر فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ ایک ڈیڑھ ہفتہ میں کام مکمل ہوا۔ کوئی چار پانچ دن میں ایڈیٹنگ ہوئی اور گھگھوگھوڑے مکمل ہوگئی۔ اب فلم کو فروخت کرنے کی بات تھی۔ اسکی تمام فیس ہم پہلے ادا کرچکے تھے۔ مگر وہ صرف ایک وعدہ تھا۔ ڈائریکٹر نے مختلف چینلز پر سی ڈیز بھجوائی اور اسکے بعد مکمل طور پر غائب ہوگیا۔ کبھی کبھی فون پر کہتا تھا کہ ٹیلی فلم فروخت ہورہی ہے۔ مگر وہ لمحہ کبھی نہ آیا۔ علی حماد اور میں اس بات پر رنجیدہ تھے کہ اسے غلط وعدہ کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ اگر وہ فلم کو فروخت نہیں کرسکتا تھا تو اسے پیسے لینے کی ضرورت کیا پڑی تھی۔ مگر ہمارا سادہ پن تھا کہ ہم اَمر کی توقع نہیں کرسکتے تھے۔ ہمارے ساتھ بالکل وہی ہوا جو نئے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علی اور مجھے دو چار ہفتے میں اندازہ ہوگیا کہ ہمارا فلمی شعبہ میں کتنی سطحیت ہے اور بنیادی طور پر یہاں پروفیشنل ازم کی کس قدر کمی ہے۔ اکثر اداکاروں کے عملی رویے کس درجہ ادنیٰ ہیں۔ اس پر طویل بحث ہوسکتی ہے۔ بہرحال قصہ کوتاہ یہ کہ " گھگھوگھوڑے " کبھی بھی، کسی بھی چینل پر رونمانہ ہوسکی۔ ہم لوگ پیسے اُجاڑ کر خاموش ہوگئے۔ مگر نایاب تجربہ نے کم از کم مجھے بہت کچھ سکھادیا۔

یہ تمہید اسلیے باندھی کہ آج کل ہر طرف شور ہے کہ ہمارے فلمی شعبہ کو ہر طریقے سے بڑھاوا دینے کی ضرورت ہے۔ اس میں سرمایہ اور جان ڈالنا ضروری ہے۔ یہ بنیادی طور پر درست بات ہے۔ مگر مسئلہ اس شعبہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی موجودگی ہے جو اس اہم ترین شعبہ کے زوال کا بذات خود سبب ہیں۔ نام لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اکثر ڈائریکٹروں کا فنی سفر دیکھیے۔ کوئی چائے بیچتا بیچتا خود بخود ڈائریکٹر بن بیٹھا ہے۔ کوئی مٹھائی فروخت کرتا کرتا خود کو ڈائریکٹر کہلوانے لگا۔ یعنی بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنے نازک کام کی اہمیت کا شعور ہے، جنہیں کام آتا ہے اور وہ جدت پسندی کی طرف مائل ہیں۔ "پرفارمز" بھی عجیب مخلوق ہیں۔ انکی واضح اکثریت میں کوئی ڈسپلن نہیں۔ بہت سی خواتین اس آڑ میں مختلف "مشکل کاموں" میں مصروف ہوتی ہیں۔ زیادہ نہیں

لکھنا چاہتا۔مگر اکثریت کے نزدیک، انکی کامیابی دوسروں کو بیوقوف بنانے میں ہے۔اس کام میں یہ لوگ کمال مہارت رکھتے ہیں۔ایک بھی ایسا مرفارمر نہیں ملا، جس نے ایکٹنگ کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہو۔کسی مستند ادارے سے فارغ التحصیل ہو۔مکالموں کی ادائیگی سے لیکر تلفظ تک، حد درجہ ادنیٰ سا ہے۔اگر کوئی محنت کرنے کیلیئے کہے، تو یہ مخلوق فوراً ناراض ہو جاتی ہے۔بہر حال اگر آج ہمارا سینما تقریباً ختم ہو چکا ہے تو اسکی بہت بڑی وجہ پرفارمر میں کسی قسم کی سنجیدگی کا فقدان ہے۔اس نقص کا کوئی علاج نہیں۔عرض نہیں کر سکتا کہ کس قدر مہیب مسائل ہیں۔اس میں نفسیاتی پیچیدگیاں بھی شامل ہیں۔جنکا ادراک بہت ہی کم لوگوں کو ہے۔

فلموں کی موسیقی ترتیب دینے والے لوگ بھی کافی غیر تسلی بخش رویے کے مالک ہیں۔یہ نہیں کہ ہمارے پاس اچھے موسیقار نہیں۔خواجہ خورشید، سلیم اقبال، بابا چشتی اور دیگر لوگ بہر حال ہماری فلم انڈسٹری سے وابسطہ تھے۔مگر اب صورتحال یہ ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی اچھا موسیقار نہیں ملتا۔یہی صورتحال گلوکاروں کی ہے۔لوگ ایک دن اُٹھتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ گلوکار ہیں۔اگر آپ فنی موسیقی کے سخت پیمانے پر انکی آواز کو پرکھیں تو حد درجہ پست سطح پر نظر آتے ہیں۔چند ہفتے پہلے میں ایک کھانے پر گیا، وہاں ایک صاحب، گانا گا رہے تھے۔محفل کے آداب کے خلاف باہر آ کر بیٹھ گیا۔موصوف، لیجینڈ گائک رفیع کو گا رہے تھے۔رفیع صاحب، اوپر کے سروں میں گاتے تھے۔انکا کمال ہی اوپر کے سروں میں آواز کو مضبوط رکھنا تھا۔موصوف کافی محنت کر رہے تھے۔مگر انہیں قطعاً ادراک نہیں تھا کہ وہ رفیع کے گانوں کے برابر پختہ آواز نہیں رکھتے۔خیر، اب وہ بھی فرماتے ہیں کہ لاہور کے مایہ ناز گلوکار ہیں۔خاموشی سے سنتا رہا اور پھر رات گئے واپس آ گیا۔اکثر لوگ فن موسیقی کی باریکیوں سے واقف نہیں ہیں۔اسلیے کوئی بھی بات کرنے کا فائدہ نہیں۔عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اچھا گانا گانا، حد درجہ مشکل کام ہے۔فنکاروں کی عمریں گزر جاتی ہیں اور پھر بھی طالبعلم رہتے ہیں۔آپکے ایل سہگل، بیگم اختر، فیض آبادی، بڑے غلام علی خان، مہدی حسن کے پایہ کے گلوکار کہاں سے لائینگے۔انکی آواز کو تو نقل تک نہیں کیا جا سکتا۔مگر بھونڈی نقل کا کام ہمارے ہاں جاری ہے۔خیر، اچھی آواز خدا کی دین ہے اور اس پر حد درجہ محنت کا رنگ چڑھانا پڑتا ہے۔پھر جا کر بات بنتی ہے۔

ہماری فلم کی ناکامی کی اصل وجہ، بیرونی نہیں بلکہ اندورنی ہے۔اسے حکومتی بیساکھیاں لگا دیں تو پھر بھی اس میں سنجیدگی لانا بے حد مشکل ہے۔لاہور کے بہترین سٹوڈیو اب گودام بن چکے ہیں۔فلمی شعبہ کے انحطاط کا اندازہ لگانا حد درجہ مشکل ہے اور اسے ٹھیک کرنا اور بھی دشوار ہے۔دس سال پہلے " گھگھو گھوڑے " بناتے ہوئے جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، آج حالات اس سے بھی زیادہ اَبتر ہیں۔اکثر سرمایہ کار، رویوں سے بددل ہو کر اس شعبہ سے کنارہ کشی کر چکے ہیں۔بلکہ بھاگ چکے ہیں۔فلمی دنیا اپنے زوال کی خود ذمہ دار ہے۔کوئی بھی باہر سے آ کر اس مردہ گھوڑے کی کوئی مدد نہیں کر سکتا!

راؤ منظر حیات